© rasailojaraid.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اشارات

جماعت اسلامی کے کُل پاکستان اجتماع کے موقع پر لاہور میں جو کچھ ہوا وہ درحقیقت ہماری قومی زندگی کا ایک بڑا المناک سانحہ ہے۔ کرایہ پر لائے ہوئے چند غنڈوں نے جن کو پہلے شراب پلائی جا چکی تھی، شریف انسانوں کے ایک پُرامن مجمع پر دن دہاڑے حملہ کیا، اور اپنی بدمستی میں یہاں تک بڑھ گئے کہ خواتین کے کیمپ پر اینٹیں اور بوتلیں پھینکیں، قرآن مجید کی جلدیں اٹھا اٹھا کر پتھروں اور اینٹوں کی طرح لوگوں کو ماریں، اور فائرنگ کرکے ایک بے گناہ انسان کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ کتنی المناک اور روح فرسا ہے یہ خبر اور کتنا بڑا گھاؤ ہے جو اسے سُن کر سینے میں پڑتا ہے۔

عقل کے جن اندھوں نے اس سارے شرمناک خونی ڈرامہ کی ہدایت کاری کا اہم فرض سرانجام دیا ہے، ممکن ہے اُن کے لیے یہ کوئی عظیم کارنامہ ہو اور اس مہم کو سر کرنے کی وجہ سے وہ اپنے آپ کو مبارکباد کا مستحق سمجھتے ہوں لیکن جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے فہم و بصیرت کی تھوڑی سی مقدار بھی دی ہے اور جن کی نظروں کو زینتِ حیاتِ دنیا کی عارضی چمک دمک نے بالکل خیرہ نہیں کر دیا ہے، ان کے لیے یہ حادثہ اپنے اندر فتح و کامرانی کا کوئی پہلو نہیں رکھتا بلکہ اخلاقی شکست کا کھلا ہوا اعلان ہے۔ یہ واقعہ اگر ایک طرف اس بات کا اظہار ہے کہ اہلِ غرض اپنے مفاد کی حفاظت کی فکر میں کہاں تک جا سکتے ہیں، تو دوسری طرف یہ اللہ کے قانونِ مکافات کو حرکت میں لانے کے لیے ایک دعوت بھی ہے۔ اگرچہ اغراض کے پیچھے اندھے ہو جانے والے لوگ اس بات کو ہمیشہ بھولے رہتے ہیں کہ اوپر کوئی خدا بھی ہے جو ان کے کرتوتوں کو دیکھ رہا ہے اور اس کے ہاں کوئی قانونِ مکافات بھی ہے جس میں دیر تو ہوتی ہے مگر اندھیر کبھی نہیں ہوتا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہ کچھ عجیب سی سا معاملہ ہے کہ جماعت اسلامی کا یہ اجتماع عام ایک ایسے ماحول میں ہوا جس پر ابتدا ہی سے نحوست کے بادل منڈلانے شروع ہو گئے تھے۔ ذرا پلٹ کر گزرے ہوئے واقعات پر ایک نگاہ ڈالیے:

جولائی ۱۹۶۳ء کے آغاز میں مرکزی مجلس شوریٰ نے اس امر کا فیصلہ کیا کہ جماعت کا کل پاکستان اجتماع ۲۵ سے ۲۸ اکتوبر تک لاہور میں منعقد ہو گا۔ اجتماع کے انتظامات کے لیے جو کمیٹی تشکیل کی گئی اس نے طے کیا کہ اجتماع کے لیے موزوں جگہ اقبال پارک (منٹو پارک) ہے۔ چنانچہ ۳۰ رجولائی کو ناظم اجتماع نے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ لاہور کو اس مضمون کی درخواست دی کہ ۱۶ راکتوبر سے ۳۱ راکتوبر تک کے لیے اس پارک کو ہمارے لیے مختص کر دیا جائے اور ہمیں اس عرصہ میں اسے استعمال کرنے کی اجازت دی جائے۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ صاحب نے ناظم باغات کی طرف رجوع کرنے کا حکم دیا جنہوں نے معاملہ کو ہوم سکرٹری کی طرف منتقل کر دیا۔ اس کے بعد ناظم اجتماع نے ہوم سکرٹری صاحب کے دفتر کے طواف شروع کیے اور انہوں نے حکم صادر کرنے میں جس دفتری لیت و لعل سے کام لیکر اس معاملہ کو معرض التوا میں ڈالا اس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ حالات کسی اچھے رخ کی طرف نہیں جا رہے ہیں۔ بالآخر تنگ آکر ۲ راکتوبر ۶۳ء کو قیم جماعت اسلامی پاکستان میاں طفیل محمد صاحب نے گورنر مغربی پاکستان کو اور ناظم اجتماع نے ہوم سکرٹری صاحب کو توجہ دلائی کہ اجتماع کے انتظامات کے لیے ہمیں کم از کم تین ہفتہ پہلے اجازت ملنی ضروری ہے۔ لہٰذا اگر ۵ راکتوبر تک ہمیں اجازت نہ دی گئی تو ہم عوام کے سامنے یہ اعلان کرنے میں حق بجانب ہونگے کہ حکومت مغربی پاکستان نے ہمیں اجتماع کی اجازت دینے سے انکار کر دیا ہے۔ اس پر آخر کار اقبال پارک کی کھلی جگہ کو چھوڑ کر آبادی کے درمیان شاہراہ عام پر وہ تنگ میدان جماعت کو دیا گیا جو بھاٹی دروازے اور ٹکسالی کے درمیان واقع ہے۔

اس مسلسل تعویق اور لیت و لعل سے اجتماع کے منتظمین کو انتظام میں جس قسم کی عملی دشواریاں پیش آئیں اور اس میں شریک ہونے والے احباب کو جس قسم کے ذہنی اضطراب سے گزرنا پڑا اس کا کچھ اندازہ وہی لوگ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کر سکتے ہیں جنہیں اس صورتِ حال سے کبھی سابقہ پیش آیا ہو۔ ایک طرف ملک کے گوشے گوشے سے پا بر کاب لوگ تذبذب میں گرفتار ہو کر بار بار اجتماع کے بارے میں استفسار کر رہے تھے، دوسری طرف منتظمین بیچارے یقین کے ساتھ کوئی جواب دینے سے قاصر تھے۔ تذبذب اور بے یقینی کی اس فضا میں جماعت کے کارکنوں پر جو گزری اور انہیں جس قسم کے نقصانات برداشت کرنے پڑے وہ تو ایک الگ داستان ہے۔ لیکن اس معاملہ کا سب سے افسوسناک پہلو یہ ہے کہ اس مسلسل "آنکھ مچولی" کے بعد اجتماع کے لیے جو جگہ عطا کی گئی وہ اس کام کے لیے کسی اعتبار سے موزوں نہ تھی۔ مقام کی یہ تبدیلی کن مصالح کی بنا پر کی گئی، اس کو تو وہی ذات جانتی ہے جو عالم الغیب والشہادہ اور علیم بذات الصدور ہے۔ مگر بعد کے واقعات اس فیصلے کی صحت کے بارے میں کوئی نیک گمان قائم کرنے کی گنجائش نہیں چھوڑتے۔

اس کے بعد لاؤڈ اسپیکر کے استعمال کی اجازت کا مرحلہ پیش آیا جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے اس سے بھی زیادہ دلچسپ ہے۔ ملک کی ایک مسلّم جماعت جو ۲۲ سال سے کام کر رہی ہے، اپنا کُل پاکستان اجتماع منعقد کرتی ہے لیکن اُسے لاؤڈ اسپیکر استعمال کرنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ ایک معمولی سمجھ بوجھ رکھنے والے انسان سے بھی یہ حقیقت پوشیدہ نہیں ہو سکتی کہ اتنے بڑے اجتماع کی کارروائی لاؤڈ اسپیکر کے بغیر ہونی محال ہے اور اس سے محروم کرنے کے معنی عملاً اجتماع کو روکنے کے ہیں۔ جماعت اسلامی کی طرف سے جب ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے اس حکم کو ہائی کورٹ میں چیلنج کیا گیا تو حکومت نے عدالت کا فیصلہ صادر ہونے سے پہلے فوراً ایک آرڈیننس نافذ کر دیا۔ اس ایک واقعہ سے اس امر کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس ملک میں انتظامیہ کو آرڈی ننسوں کے ذریعہ سے قانون سازی کے جو غیر معمولی اختیارات دیئے گئے ہیں وہ کس طرح استعمال کیے جاتے ہیں۔

ان سب موانع کے باوجود جب اجتماع منعقد کرنے کا فیصلہ ہی کر لیا گیا تو اجتماع سے دو تین روز پہلے مرکزی اور صوبائی وزراء نے یکایک جماعت اور اس کے امیر کے خلاف بیانات کی ایک

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مہم شروع کردی۔ یُوں نظر آتا ہے کہ ۲۳ راکتوبر کو اچانک ان پر یہ راز منکشف ہو گیا تھا کہ یہ جماعت اور اس کا قائد ملک و ملت کے دشمن ہیں، اس لیے فوراً انہوں نے یہ ضرورت محسوس کی کہ اجتماع سے پہلے پہلے عوام کو اس سے خبردار کردیں تاکہ ملک کو کوئی نقصانِ عظیم نہ پہنچ جائے۔ حالانکہ نہ جماعت اسلامی کوئی نئی جماعت تھی اور نہ اس کا امیر کہیں خلاء میں سے زمین پر آن اترا تھا۔ امیر جماعت کو اس برِعظیم میں کام کرتے ہوئے چالیس سال گزر چکے ہیں اور اس مدت میں ان کے لکھے ہوئے ہزاروں صفحات لاکھوں آدمیوں نے پڑھے ہیں اور ملک کے ہزار ہا گھروں میں ان کی کتابیں موجود ہیں۔ اسی طرح جماعت اسلامی ۲۲ سال سے اس برِعظیم میں کام کر رہی ہے۔ اور اس کا عیب و صواب جو کچھ بھی ہے سارے ملک پر عیاں ہے۔ جماعت کی ہیئت، اس کا طریقِ کار، اس کا دستور، اس کا منشور، اس کی قراردادیں اور اس کی آج تک کی تاریخ، غرض کوئی چیز بھی ایسی نہ تھی جو معلومِ عوام نہ ہو اور پہلی مرتبہ ہی ان حضرات پر منکشف ہو گئی ہو۔ اب یہ بات بالکل ناقابلِ فہم ہے کہ اجتماع سے دو تین روز پہلے آخر کیا نئی بات ایسی پیش آگئی تھی جسے طشت ازبام کرنے کے لیے ان وزراء کو ایک تازہ مہم چلانے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ پھر اس تازہ مہم میں بھی انہوں نے کوئی نیا انکشاف نہیں کیا بلکہ پندرہ پندرہ اور بیس بیس سال پرانی باتیں ہی دُہرانی شروع کردیں، گویا کہ یہ اب ان کے علم میں آئی ہیں۔

اس کے بعد اجتماع میں جس شرمناک کھیل کا مظاہرہ ہوا، اس پر جس قدر بھی ماتم کیا جائے اُسی قدر کم ہے۔ یُوں محسوس ہوتا تھا کہ شیطنت، تہذیب و شائستگی کے سارے پردے اتار کر اب ننگا ناچ ناچنے میں منہمک ہے۔ ایک طرف تہذیب و شرافت تھی اور دوسری طرف گندی گالیاں۔ ایک جانب مظلومانہ مدافعت تھی اور دوسری جانب دراز دستیاں۔ ایک طرف صبر و وقار تھا اور دوسری طرف نہایت ذلیل قسم کی غنڈہ گردی۔ اور حیرت کی بات یہ ہے کہ یہ سب کچھ عوام کی جان و مال اور عزت و آبرو کے محافظوں کے سامنے کھلے بندوں ہو رہا تھا اور وہ اسے بالکل تماشائیوں کی طرح دیکھ رہے تھے۔ ان کے اس طرزِ عمل کا مشاہدہ دو چار آدمیوں نے نہیں ہزاروں حاضرین نے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کیا ہے - پھر عجیب بات یہ ہے کہ غنڈے بیس پچیس سے زیادہ نہ تھے - شہر کے جانے پہچانے بدمعاش تھے جن سے پولیس کا ناواقف ہونا ممکن نہیں ہے - اجتماع میں کوئی ہڑبونگ نہ تھی کہ غنڈے اس میں چھپ جاتے - ساری اجتماع گاہ میں وہی چند آدمی کودتے پھر رہے تھے اور علانیہ سب سے الگ نظر آ رہے تھے - اور انہی میں سے ایک نے پولیس کی آنکھوں کے سامنے ایک بے گناہ کارکن کو قتل کیا - لیکن امن کے کسی محافظ نے ان غنڈوں کو گرفتار نہ کیا - اور آج اُن کو یہ تحقیق کرنے میں بھی مشکل پیش آ رہی ہے کہ قاتل کون تھا -

---

یہاں انسان کے ذہن میں قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ لوگ جنہوں نے یہ غنڈہ گردی کی ہے، انہیں ایک دینی یا سیاسی جماعت کے جلسے سے بذاتِ خود کیا دلچسپی ہو سکتی تھی - جن لوگوں کا شیوہ مسافروں کی گرہیں کاٹنا ہے، سینماؤں کے ٹکٹوں کی بلیک کرنا ہے، جُوا کھیلنا ہے، انہیں آخر کونسی جاذبیت جماعت اسلامی کے "غیر دلچسپ" اجتماع میں کھینچ کر لے آئی - ایک ایسا اجتماع جس میں کسی قوالی یا ریکارڈنگ کا انتظام موجود نہ ہو، جس میں کسی چلتے دار تقریر کی بھی گنجائش نہ ہو، حتیٰ کہ جس میں لاؤڈ سپیکر بھی موجود نہ ہو، اس میں ان "اصحابِ ذوق" کی تشریف آوری کیسے ہوئی، یہ آسانی سے سمجھ میں آنے والی بات نہیں ہے - یہ لوگ تو اس قسم کی بے کیف مجالس کے سایہ سے بھی دور بھاگتے ہیں - مگر یہاں اُن کا یہ حال تھا کہ وہ ایک گروہ کی صورت میں اُمڈے چلے آ رہے تھے -

یہ واقعہ محض اس بنا پر کسی کے لیے خوش آئند نہیں ہونا چاہیے کہ یہ جماعت اسلامی کے ساتھ پیش آیا ہے جس سے کچھ لوگ ناراض ہیں - درحقیقت یہ ہماری قومی زندگی کے لیے ایک خطرہ ہے جسے اگر پرورش پانے دیا گیا تو ہمارے قومی معاملات سنجیدہ بحث و کلام اور آئینی طریق کار سے طے ہونے کے بجائے دنگے اور فساد سے طے ہونے لگیں گے اور شریف و معقول آدمیوں کے لیے یہاں کام کرنا ممکن نہ رہے گا -

---

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہ سب کچھ ہو جانے کے بعد توقع تھی کہ اربابِ اختیار سنجیدگی کے ساتھ سارے معاملے پر پھر غور کریں گے اور کم از کم اب تو اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ کسی حزبِ اختلاف کے اصول، مقصد اور کام کو خواہ وہ کتنا ہی ناپسند کرتے ہوں، مگر انہیں معقول جمہوری طریقوں ہی سے اس کا مقابلہ کرنا چاہیے اور اس کے خلاف نفرت پھیلانے سے باز رہنا چاہیے۔ لیکن افسوس ہے کہ یہ توقع بھی پوری نہ ہوئی بلکہ نفرت انگیزی کی مہم پہلے سے زیادہ زور شور کے ساتھ چل رہی ہے اور جماعت اور امیرِ جماعت پر ایک سے ایک بڑھ کر گھناؤنے الزامات بے تحاشا لگائے جا رہے ہیں۔ ہم عرض کرتے ہیں کہ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے اتنے وسیع و عریض ملک پر اختیار و اقتدار بخشا ہے اور جنہیں کروڑوں بندگانِ خدا کی عزت و آبرو اور جان و مال کا امین بنایا گیا ہے، اُن کے ظرف میں بھی کافی وسعت ہونی چاہیے۔ جو لوگ ذرا ذرا سے اختلاف پر مشتعل ہو کر آپے سے باہر ہو جاتے ہوں، اور اختلاف کرنے والوں سے وہ سلوک شروع کر دیتے ہوں جس کا مظاہرہ ہم جماعت اسلامی کے معاملے میں دیکھ رہے ہیں، ان کے فہم و تدبر کے بارے میں کوئی اچھی رائے قائم نہیں کی جا سکتی۔ حکومت و فرمانروائی بشرطیکہ اس کا مقصد فی الواقع اہلِ ملک ہی کی خدمت ہو، بڑی نازک ذمہ داری ہے اور اس سے وہی لوگ بطریقِ احسن عہدہ برآ ہو سکتے ہیں جو صرف مدح و توصیف سننے کے آرزومند نہ ہوں بلکہ تنقید کو برداشت کرنے کا حوصلہ بھی رکھتے ہوں۔ جو حضرات ملک کی زمام کار اس مفروضہ کے ساتھ سنبھالتے ہیں کہ ملک کی پوری آبادی اپنے ذہن، شعور، احساس اور ضمیر کو برسرِ اقتدار طبقہ کے ہاتھ میں گروی رکھ کر، اس سے اپنی وفاداری استوار کرے گی۔ وہ خود اپنے لیے اور پوری قوم کے لیے بہت سی پیچیدگیاں پیدا کر دیتے ہیں۔ تنقید کا ہر حرف لازمی طور پر فسادِ نیت ہی کا نتیجہ نہیں ہوتا اور اختلاف کی ہر آواز ہمیشہ حسد کی آگ میں جلتے ہوئے ہی بلند نہیں کی جاتی۔ اختلاف نیک نیتی سے بھی کیا جا سکتا ہے۔ اور قوم میں کوئی گروہ ایسا بھی ہو سکتا ہے جو ایمانداری کے ساتھ کچھ باتوں کو غلط سمجھ کر ان کی اصلاح کے لیے کوشاں ہو۔ اس بنا پر یہ سمجھ لینا کہ اتنے بڑے ملک میں جو شخص یا گروہ بھی اقتدار کے نقطۂ نظر سے سو فیصدی متفق نہیں ہوتا وہ لازمی طور پر ملک و ملت کا دشمن ہی ہے، بہت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بڑی غلطی ہے اور اس کا جس قدر جلدی ازالہ کر لیا جائے اتنا ہی ملک اور حکمران طبقے دونوں کے لیے بہتر ہے۔ جماعت اسلامی ۱۶ سال سے پاکستان میں کام کر رہی ہے اور ان ۱۶ برسوں میں بہاں کیا کچھ نہیں ہو چکا ہے۔ مگر کوئی شخص ایک مثال بھی ایسی پیش نہیں کر سکتا کہ اس جماعت نے کبھی کسی سے سودے بازی کی ہو، یا اس کے کسی آدمی نے کسی عہدہ و منصب کے لیے دوڑ دھوپ کی ہو، یا اس کا کوئی رکن اس بہتی گنگا میں ہاتھ دھوتا نظر آیا ہو جس میں دوسرے لوگ غوطے لگا رہے تھے کیا کسی صاحبِ ضمیر آدمی کے لیے جماعت کی یہ تاریخ اس بات کا یقین دلانے کو کافی نہیں ہے کہ اس کا اختلاف اغراض پر نہیں بلکہ ایمانداری پر مبنی ہے؛

دنیا میں جہاں کہیں بھی برسرِ اقتدار طبقہ حزب اختلاف سے نمٹنے کے لیے اوچھے ہتھیاروں پر اتر آتا ہے اس سے لوگوں کو اس امر کا یقین ہو جاتا ہے کہ اس کا موقف اخلاقی اعتبار سے کمزور ہے۔ یہ طریقہ اقتدار کو مضبوط کرنے والا نہیں ہوتا بلکہ اس کو ضعف پہنچانے کا موجب ہوتا ہے اقتدار کے لیے مضبوط ترین بنیاد اگر کوئی ہے تو وہ یہ کہ لوگوں کو اس کے موقف کی صحت کا اطمینان ہو۔ اس اطمینان کو متزلزل کر دینے کے بعد اہلِ اقتدار مجبور ہو جاتے ہیں کہ انتظامیہ کی طاقت پر انحصار کریں اور دلوں پر حکومت کرنے کے بجائے صرف جسموں کو تابع بنا کر رکھیں۔

ہمارے ملک میں جو چیز آج تک جمہوریت کے صحیح نشو و نما میں حائل رہی ہے وہ اصحاب اقتدار کی یہی غیر دانشمندانہ روش ہے۔ جب بھی کوئی گروہ برسرِ اقتدار آیا اور اس نے اپنے ناعاقبت اندیشانہ طرزِ عمل کی وجہ سے عوام میں اپنی مقبولیت کھونا شروع کی تو اس نے اپنی روش میں اصلاح کرنے کی بجائے انتظامیہ کو براہِ راست اپنی امداد پر اُبھارا اور اس کی طاقت کو اپنے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا۔ اس طریقِ کار سے برسرِ اقتدار طبقوں کو جو فائدہ حاصل ہوا وہ تو الگ بحث ہے، جس میں ہم اس وقت پڑنا نہیں چاہتے۔ البتہ ایک چیز بالکل واضح ہے کہ اس قسم کی غلط تدبیروں سے آج انتظامیہ ملک کی خادم بننے کی بجائے اس کی غیر مسئول قوت حاکمہ بن گئی ہے۔ یہ طبقہ جس طرح

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

چاہتا ہے من مانی کارروائیاں کرتا ہے، اس کے ہاتھوں لوگوں کے ساتھ طرح طرح کی بے انصافیاں ہو رہی ہیں، اور حکومت کے جو فیصلے بھی اس نوکر شاہی طبقہ کے مزاج اور مفاد کے خلاف ہوتے ہیں، وہ نافذ نہیں ہونے پاتے۔ ایسے ہی حالات ہوتے ہیں جن میں عوام یہ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ اُن کی رائے اُن کے اپنے ملک میں قطعاً کوئی وزن نہیں رکھتی بلکہ اصل قدر انہی لوگوں کی ہے جو حکومت کی انتظامی مشنری پر کسی نہ کسی حیثیت سے قابض ہو گئے ہیں۔ اس سے لوگوں کے اندر افسردگی اور ملکی معاملات سے عدم دلچسپی پیدا ہو جانا ایک فطری بات ہے اور یہ عوارض قومی زندگی کو کھوکھلا کر کے رکھ دیتے ہیں۔

ہمارے ملک میں نوکر شاہی کے بڑھے ہوئے حوصلے ایک اور وجہ سے بھی انتہائی تشویشناک ہیں۔ اس خطہ پر ۱۹۰ برس بیشتر ایک ایسی قوم حکومت کر رہی تھی جو افکار و نظریات، احساسات و جذبات اور اطوار و عادات کے اعتبار سے ہم سے بالکل مختلف تھی۔ اس قوم کو ہم سے بجز اس کے اور کوئی دلچسپی نہ تھی کہ ہم اس کے کارخانوں کے لیے خام مال مہیا کریں اور پھر جو مال وہاں تیار ہو اس کی کئی گنی قیمت ادا کر کے اسے دنیاوی اعتبار سے فارغ البال کر دیں۔ اس بنا پر یہ قوم ہمیں انسان سمجھ کر ہم سے انسانوں جیسا برتاؤ نہ کرتی تھی بلکہ ہمیں جانوروں سے بھی بدتر مخلوق خیال کر کے ہم سے بڑا ظالمانہ سلوک روا رکھتی تھی۔ پھر وہ اس حقیقت کو بھی اچھی طرح جانتی تھی کہ اس ملک پر قبضہ کرنے اور اس کی دولت کو اندھا دھند لوٹنے کے لیے اس کے پاس کوئی جواز نہیں، اس لیے وہ ڈاکوؤں کی سی ذہنیت کے ساتھ صرف تشدد کے ذریعہ اپنے کام نکالتی تھی۔ اسے یہ معلوم تھا کہ جب بھی اہلِ ملک کا شعور بیدار ہوگا، اسے اس خطّے کو خیر باد کہنا ہوگا۔ اس بنا پر اسے اس بات کی فکر دامنگیر رہتی تھی کہ کسی طرح لوگوں کے اندر بیداری نہ پیدا ہونے پائے۔

ان مقاصد کے حصول کے لیے اُس نے وہ سارے شرمناک حربے استعمال کیے جو استعمار پسند قومیں عام طور پر کرتی ہیں۔ اس نے سب سے پہلے اس امر کا التزام کیا کہ انتظامیہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کو زیادہ سے زیادہ اختیارات سونپے جائیں تاکہ اس کی مدد سے مخالفین کو اچھی طرح دبایا جاسکے اور ایسے عوام کی گردنوں پر اس طرح مسلط کر دیا جائے کہ وہ بھیڑوں کا ایک گلہ بن جائیں جنہیں اقتدار کی لاٹھی جس طرف چاہے میکانکی طور پر ہانک کرلے جائے۔

اس "کارِ خیر" کو کامیابی کے ساتھ سرانجام دینے کے لیے انتظامیہ کو خاص تربیت دی گئی اور انہیں قومی وملی احساسات سے بیگانہ کیا گیا تاکہ کسی آزمائش کے وقت اُن کے ہاتھوں میں کوئی لرزش نہ پیدا ہونے پائے اور وہ بے حس مشینوں کی طرح اپنی ہی قوم کو دبانے کی خدمت انجام دینے پر ہر وقت آمادہ رہیں۔

اسے ہماری بدنصیبی کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ ہماری انتظامیہ کو انگریز کی تربیت یافتہ انتظامیہ سے ترکہ میں بہت سی روایات ملی ہیں۔ اس کے اندر درشتی، تکبّر اور نخوت کے جذبات کی وہی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں جن کے مظاہرے ہم انگریزی عہد میں بالعموم دیکھتے تھے۔ عوامی احساسات سے اس کے تغافل میں کوئی خاص فرق واقع نہیں ہوا۔ اس صورتِ حال میں عوام اگر مایوس نہ ہوں تو اور کیا کریں۔ برسرِ اقتدار طبقے بیشک یہ پروپیگنڈا کرتے رہیں کہ مایوسی کی یہ لہر کسی "اقتدار کی خواہاں" جماعت نے دوڑائی ہے۔ لیکن عوام اصل حقیقت سے پوری طرح واقف ہیں۔ ان بیچاروں کو جن ٹھوس واقعات اور تلخ حقائق سے دن رات سابقہ پیش آتا ہے وہ اس سے آخر کس طرح صرفِ نظر کر سکتے ہیں۔ وہ انتظامیہ کے ہاتھ میں اپنے آپ کو بے بس محسوس کر رہے ہیں اور ان کے اندر یہ حوصلہ شکن احساس روز بروز بڑھ رہا ہے کہ ملک کے معاملات کا فیصلہ اب اُن کے ہاتھ میں نہیں رہا بلکہ ایک ایسے مختصر سے طبقہ کے ہاتھ میں ہے جو ان کے احساسات وجذبات سے یکسر بیگانہ اور اُن کے دل کی دھڑکنوں کو سمجھنے سے عاجز ہے۔

جماعت اسلامی اور اس کے امیر کے خلاف پروپیگنڈے کا جو خوفناک طوفان اس وقت اٹھایا جا رہا ہے وہ افسوسناک ہونے کے علاوہ بڑا عبرتناک بھی ہے۔ اسے دیکھ کر انسان اندازہ کر سکتا ہے کہ جو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور ضد کے جذبات میں بہک کر لوگ کس سطح تک اُتر جاتے ہیں اور غیظ و غضب ان کے دماغی توازن کو کس حد تک بگاڑ دیتا ہے ۔ پراپیگنڈے کی اس مہم میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی طرف بعض ایسی باتیں منسوب کی گئی ہیں جن سے ان کا دامن ہمیشہ پاک رہا ہے بلکہ انہوں نے انہیں مٹانے کے لیے سر توڑ کوشش کی ہے ۔ ان کی تحریروں کا ایک ایک حرف اور اُن کی تقریروں کا ہر لفظ بلکہ اُن کی زندگی کا ہر لمحہ اس حقیقت کی غمازی کرتا ہے کہ انہیں ان چیزوں سے کتنی نفرت ہے اور وہ ملک و قوم کے لیے انہیں کتنا نقصان دہ سمجھتے ہیں ۔ ان چیزوں میں شاید سرِ فہرست "طاقت کے ذریعہ اقتدار کی تبدیلی ہے" ۔ وزیر داخلہ صاحب نے الزام لگایا ہے کہ مولانا قوت کے ذریعہ اقتدار حاصل کرنا چاہتے ہیں وہ شخص جس نے مولانا کی تحریروں کا سرسری مطالعہ بھی کیا ہے یا جو اُن کے طرز فکر سے بالکل سرسری واقفیت بھی رکھتا ہے وہ جانتا ہے کہ یہ چیز مولانا کے مزاج سے قطعاً کوئی مناسبت نہیں رکھتی ۔ انہوں نے سیاسی تبدیلی کے لیے قوت و طاقت کے استعمال کی ہمیشہ مذمت کی ہے اور لوگوں کو اس بات کا قائل کیا ہے کہ اس قسم کی مصنوعی تبدیلیوں سے ملک کے اندر کوئی خوشگوار انقلاب نہیں آسکتا ۔ اسے زمانے کی ستم ظریفی کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ قوت کے ذریعہ سے برسرِ اقتدار آنے والے لوگ ہی اب اُلٹا مولانا پر یہ الزام لگانے کی جسارت کر رہے ہیں

نوابزادہ لیاقت علی خاں کے قتل پر مولانا محترم نے جن احساسات کا اظہار فرمایا تھا اس میں انہوں نے اس رجحان کی بڑی سختی سے مخالفت کی اور بتایا کہ اگر کوئی قوم عقل و فکر سے یکسر عاری نہیں ہو چکی تو وہ سیاسی تبدیلی کے لیے قوت کبھی استعمال نہیں کرتی ۔ اسی موضوع پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

"یہ واقعہ اس لحاظ سے خطرناک بھی ہے کہ یہ اس ملک میں ایک بہت بڑے رجحان کے اُبھرنے کی علامت ہے ۔ اگرچہ سردست یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس حرکت کا محرک کیا تھا ۔ کوئی مذہبی محرک تھا یا شخصی ۔ لیکن اگر فی الواقع وہ کوئی سیاسی محرک تھا تو یقیناً یہ حالات کو ایک ایسے رُخ کی طرف موڑنے والی حرکت ہے جس کی ہر اُس شخص کو مذمت کرنی چاہیے جو اس ملک اور اس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ملت کی فلاح چاہتا ہو۔ کسی ملک کے لیے اس سے بڑھ کر اور کوئی بدقسمتی نہیں ہوسکتی کہ اس میں فیصلے کا آخری اختیار عقل، شعور، دلیل اور رائے عامہ سے چھین کر قاضی شمشیر کے سپرد کر دیا جائے۔ یہ قاضی کوئی عادل اور صاحب فکر قاضی نہیں ہے یہ اندھا، بہرا اور گونگا قاضی ہے۔ اس سے جب کبھی فیصلہ چاہا گیا ہے۔ اس نے حق اور انصاف دیکھ کر نہیں بلکہ خون کی رشوت لیکر فیصلہ کیا ہے۔ اور جس نے بھی زیادہ خون چڑھا دیا ہے اسی کے حق میں اس نے فیصلہ دے دیا ہے۔ خواہ وہ حق پر ہو یا ناحق پر، خواہ وہ نیک ہو یا بد۔ کوئی قوم جو خود اپنی دشمن نہ ہو اور جس کی عقل کا دیوالہ نہ نکل چکا ہو، ایسی بیوقوف نہیں ہوسکتی کہ اپنے معاملات کا فیصلہ شعور و استدلال کے بجائے تلوار کے اندھے اور رشوت خوار قاضی کے حوالہ کر دے۔ اگر ہم اپنا مستقبل تاریک نہیں کرنا چاہتے تو ہمیں پوری طاقت کے ساتھ اپنے ملک کے حالات کو اس خطرناک رُخ پر جانے سے روکنا چاہیے۔"

(ہمارے داخلی اور خارجی مسائل مطبوعہ ۱۹۵۱ء ص ۲)

اسی سلسلہ میں جماعت اسلامی کی مجلس شوریٰ کی ایک قرارداد بھی ملاحظہ فرمائیں جو اس نے ستمبر ۱۹۴۸ء میں طریق کار متعین کرتے ہوئے پاس کی تھی:

"اپنے اس مقصد کے لیے یہ جماعت ایسے ذرائع اور طریقوں کا استعمال جائز نہیں سمجھتی جو صداقت اور دیانت کے خلاف ہوں، یا جن سے بدنظمی اور بدامنی رونما ہو۔ وہ اصلاح و انقلاب کے لیے جمہوری طریقوں پر یقین رکھتی ہے، یعنی تبلیغ و تلقین کے ذریعے سے اذہان اور سیرتوں کی اصلاح کی جائے اور رائے عام کو ان تغیرات کے لیے ہموار کیا جائے جو ہمارے پیش نظر ہیں۔ جماعت کا کوئی کام خفیہ نہیں ہے بلکہ سب کچھ علانیہ ہے۔ جن قوانین پر ملک کا نظم و نسق اس وقت چل رہا ہے ان کو وہ توڑنا نہیں چاہتی بلکہ اسلامی اصولوں کے مطابق بدلنا چاہتی ہے۔ جو لوگ ملک کا نظم و نسق چلا رہے ہیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

انہیں ہٹانا یا خود ان کی جگہ لینا اس کے پیشِ نظر نہیں ہے بلکہ وہ انہیں ہم خیال بنانا چاہتی ہے اور اگر وہ اصلاح قبول نہ کریں تو پھر جمہوری طریقوں پر انہیں ایسے لوگوں سے بدلنا چاہتی ہے جو اصلاح یافتہ رائے عام کے نزدیک صالح ہوں "

انہی اصولوں کو اُس دستور میں شامل کیا گیا جو ۱۹۵۲ء میں جماعت اسلامی کی مجلسِ دستور ساز نے مرتب کیا تھا۔ اور یہ اصول جُوں کے توں اس ترمیم شدہ دستور میں بھی موجود ہیں جو ۱۹۵۷ء میں بنایا گیا تھا اور جس پر اس وقت جماعت کام کر رہی ہے (ملاحظہ ہو دستور جماعت ۱۹۵۲ء، دفعہ ۱۰۔ اور دستور جماعت ۱۹۵۷ء۔ دفعہ ۵)

محولہ بالا تصریحات کو بار بار پڑھیے اور پھر خود اندازہ لگائیے کہ جو لوگ مولانا اور جماعت اسلامی پر سیاسی تبدیلی کے لیے قوت و طاقت کے استعمال کا الزام لگا رہے ہیں وہ اپنے پاس حق پرستی اور انصاف پسندی کا کتنا سرمایہ رکھتے ہیں۔ پھر یہاں یہ عرض کر دینا بھی ضروری ہے کہ ان اقتباسات میں جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے انہیں تحریکِ اسلامی کے وسیع لٹریچر کے کسی مستور گوشے سے اٹھا کر وقتی ضرورت کے پیشِ نظر اجاگر نہیں کیا گیا ہے۔ یہ وہ عام خیالات ہیں جن کی جھلکیاں اس کے پورے ادب میں دیکھی جا سکتی ہیں بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ آئینی و جمہوری ذرائع کے استعمال سے تبدیلی کی امنگ جماعت کے مزاج کا ایک نہایت ضروری حصہ ہے تو یہ زیادہ صحیح ہوگا۔

جماعت اسلامی تو اپنے ہی ملک میں نہیں بلکہ دوسرے اسلامی ممالک میں بھی کام کرنے والے نوجوانوں کو مسلسل یہ تلقین کر رہی ہے کہ وہ مسلح انقلاب اور زیرِ زمین تحریکوں کو چھوڑ کر کھلے میدان آئینی و جمہوری طریقوں سے اصلاحِ احوال کی جدوجہد کریں۔ چنانچہ گذشتہ حج کے موقع پر اسلامی ممالک کے نوجوانوں کے ایک اجتماع میں امیرِ جماعت نے جو تقریر کی وہ اُن کے طرزِ فکر کی پوری طرح ترجمانی کرتی ہے۔ انہوں نے فرمایا:

"اسلامی تحریک کے کارکنوں کو میری آخری نصیحت یہ ہے کہ انہیں خفیہ تحریکیں چلانے اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اسلحہ کے ذریعہ سے انقلاب برپا کرنے کی کوشش نہ کرنی چاہیے۔ یہ بھی دراصل بے صبری اور جلد بازی ہی کی ایک صورت ہے اور نتائج کے اعتبار سے دوسری صورتوں کی بہ نسبت زیادہ خراب ہے۔ ایک صحیح انقلاب ہمیشہ عوامی تحریک ہی کے ذریعہ سے برپا ہوتا ہے۔ کھلے بندوں عام دعوت پھیلائیے۔ بڑے پیمانہ پر اذہان اور افکار کی اصلاح کیجیے۔ لوگوں کے خیالات بدلیے۔ اخلاق کے ہتھیاروں سے دلوں کو مسخر کیجیے۔ اور اس کوشش میں جو خطرات اور مصائب بھی پیش آئیں ان کا مردانہ وار مقابلہ کیجیے۔ اس طرح بتدریج جو انقلاب برپا ہوگا وہ ایسا پائیدار اور مستحکم ہوگا جسے مخالف طاقتوں کے ہوائی طوفان محو نہ کر سکیں گے۔ جلد بازی سے کام لیکر مصنوعی طریقوں سے اگر کوئی انقلاب رونما ہو بھی جائے تو بس راستے سے وہ آئے گا اسی راستے سے وہ مٹایا بھی جا سکے گا۔"

(ترجمان القرآن ماہ جون ۶۳ء جلد ۶۰ عدد ۳)

اس سلسلہ میں یہ امر بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ مولانا محترم کی جن تحریروں سے آج یہ نتیجہ اخذ کیا جا رہا ہے کہ وہ سیاسی تبدیلی کے لیے طاقت استعمال کرنے کے قائل ہیں ان میں سے کوئی تحریر بھی نئی نہیں ہے۔ الجہاد فی الاسلام پہلی بار ۱۹۳۰ء میں شائع ہوئی۔ اور اب تک اس کے چار ایڈیشن کئی ہزار کی تعداد میں نکل چکے ہیں۔ اسی طرح خطبات جس کے آخری دو خطبے جہاد پر ہیں، ۱۹۳۰ء کی لکھی ہوئی کتاب ہے اور اب تک اس کے اتنے ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں کہ اس کتاب کی اگر مجموعی اشاعت کا اندازہ لگایا جائے تو وہ کسی طرح بھی ایک لاکھ سے کم نہ ہو گی۔ پھر اس کے آخری دونوں خطبے "حقیقتِ جہاد" کے نام سے بھی الگ شائع ہوئے ہیں۔ اور اس پمفلٹ کی اشاعت بھی ہزاروں تک پہنچتی ہے۔ ایک محتاط اندازہ کے مطابق مولانا کی یہ دو کتابیں اس وقت کم از کم دو لاکھ گھروں میں موجود ہیں۔ اس کے علاوہ ان خطبات کو ملک کی ہزاروں مساجد میں پورے التزام کے ساتھ سنایا گیا ہے اور لاکھوں افراد نے انہیں سنا ہے۔ انسانوں کی اتنی کثیر تعداد میں آج تک کسی ایک کے ذہن رسا نے بھی ان سے وہ معانی اخذ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نہیں کیے جو آج وزیرِ داخلہ صاحب اخذ کر رہے ہیں۔ ان کا یہ مطلب اب تک صرف دو گروہوں نے اخذ کیا ہے۔ ایک قادیانی، دوسرے منکرینِ حدیث۔ اس پر الفضل اور طلوعِ اسلام کے صفحات شاہد ہیں۔ اور ہر شخص جانتا ہے کہ یہ دونوں گروہ مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کی عداوت میں کس قدر اندھے ہو چکے ہیں اور اس عداوت کی اصل وجہ کیا ہے۔ وزیر صاحب کو زبان کھولنے سے پہلے یہ سوچ لینا چاہیے تھا کہ مولانا محترم کی یہ تحریریں کہیں انبار خانوں میں دبی ہوئی تو نہیں ہیں۔ یہ بے شمار لوگوں کے زیرِ مطالعہ رہتی ہیں۔ وہ جب اپنے ملک کی ایک ذمہ دار شخصیت کی زبان سے ایسی باتیں سنیں گے تو ان کے بارے میں کیا رائے قائم کریں گے۔

ہم اس ملک کے پڑھے لکھے اور سنجیدہ طبقہ کو اس بات کی دعوت دیتے ہیں کہ وہ براہ کرم الجہاد فی الاسلام کے دو ابواب یعنی باب سوم "مصلحانہ جنگ" اور باب چہارم "اشاعتِ اسلام اور تلوار" اور اسی طرح "خطبات" کے آخری دو خطبے "جہاد" اور "جہاد کی اہمیت" کا خود غیر جانبدارانہ مطالعہ کریں اور دیکھیں کہ کیا واقعی ان سے وہی نتائج نکلتے ہیں جن کی طرف وزیر صاحب بار بار اشارہ کر رہے ہیں۔

ہم یہ بات کسی فخر و مباہات کے جذبے سے نہیں بلکہ محض تحدیثِ نعمت کے طور پر عرض کرتے ہیں کہ ہم نے آج تک کبھی بھی کوئی فیصلہ اپنے ذاتی مفاد کو سامنے رکھ کر نہیں کیا بلکہ ہر قدم خدا اور رسولؐ کے احکام کے تحت اسلام اور امتِ مسلمہ کے مجموعی مفاد کو پیشِ نظر رکھ کر اٹھایا ہے۔ تقسیم ملک کی جدوجہد کے معاملہ میں ہم نے جو رویہ اختیار کیا تھا اُس میں بھی ہمارے سامنے صرف اُمت کی بھلائی ہی تھی۔ اس میں کوئی ذاتی غرض شامل نہ تھی۔ ہمارے اس رویے کو سمجھنے کے لیے حسب ذیل امور کو نگاہ میں رکھنا چاہیے:

—— سیاسی کشمکش حصہ سوم کے مضامین جن کا حوالہ آج دیا جا رہا ہے، ۱۹۳۹ء اور ۱۹۴۰ء میں لکھے گئے تھے جبکہ ابھی یہ مسئلہ طلب تھا کہ ہندوستان (قبل تقسیم) کے متحدہ ہندوستان میں اسلام

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور مسلمانوں کے مستقبل کو محفوظ کرنے کی کیا صورت ہے۔ اس کتاب کے مصنف کی نگاہ میں اس کی جو صحیح ترین اور مناسب ترین صورت تھی اسے انہوں نے دلائل کے ساتھ پیش کیا، اور یہ بتایا کہ دوسری جو صورتیں تجویز کی جارہی ہیں ان میں کیا قباحتیں ہیں اور ان کے کیا نتائج ہونگے۔

——— مسلم لیگ نے جب ۱۹۴۰ء میں اپنا مشہور ریزولیشن پاس کیا جس میں پاکستان کو مسلمانوں کا قومی نصب العین قرار دیا گیا تھا، اس وقت کسی سے بھی یہ امر پوشیدہ نہ تھا، اور بہت سے دردمند مسلمان رہنما اسے محسوس کر رہے تھے کہ یہ صرف آدھی قوم کے مسئلے کا حل ہے۔ بقیہ آدھی قوم جو ہندوستان کے بڑے حصے میں ایک کمزور اقلیت کی حیثیت سے منتشر ہے وہ اسی تنگ دل اور متعصب اکثریت کے رحم وکرم پر رہ جائے گی جس سے نجات حاصل کرنے کے لیے ایک الگ وطن کا مطالبہ کیا جارہا ہے۔ بلکہ الگ وطن بن جانے کے بعد اس کی حالت اور بھی زیادہ خراب ہوجائے گی۔

——— برطانوی ہند کے سیاسی حالات ۱۹۴۰ء اور ۱۹۴۷ء کے درمیان جس نہج پر جارہے تھے انہوں نے یہاں کافی حد تک بے یقینی کی فضا قائم کر رکھی تھی۔ انگریز آخری وقت تک تقسیم ملک سے انکار کرتا رہا اور پوری مسلم قوم کے ساتھ "آنکھ مچولی" کھیلتا رہا۔ اِدھر مسلم قوم کی قیادت جن لوگوں کے ہاتھ میں تھی اُن میں ایک کثیر تعداد ایسے لوگوں کی تھی جنہیں صرف مفادات نے مسلم لیگ سے وابستہ کر دیا تھا۔ قائداعظم پر ان لوگوں کے خلوص کی حقیقت پوری طرح واضح تھی، اس لیے وہ کوئی سخت قدم اٹھانے سے ہمیشہ گریز کرتے رہے اور اس بات کے لیے کوشاں رہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کے مسئلہ کا کوئی معقول حل اگر تقسیم ملک علاوہ بھی سامنے آجائے تو اُسے مان لیا جائے۔ غالباً اسی جذبہ کے تحت انہوں نے کیبنٹ مشن پلان کو قبول کرنا گوارا کیا۔ اگر کانگرس اس معاملے میں بدعہدی نہ کرتی تو آج حالات بالکل مختلف ہوتے۔

——— اس کے علاوہ کسی چشم بینا سے یہ حقیقت بھی اوجھل نہ تھی کہ پاکستانی تحریک جس انداز سے چلائی جارہی تھی اور جن لوگوں کے ہاتھوں چل رہی تھی اُس سے ایک قومی ریاست کا قیام تو ممکن تھا لیکن اس سے آگے کی مہم یعنی اس کو اسلامی ریاست میں تبدیل کرنا، جس کی آرزو میں مسلمان من حیث القوم

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس تحریک میں شامل ہو گئے تھے اس تحریک اور ان لیڈروں اور کارکنوں کے بس کا کام نہ تھا۔
ہماری ملی زندگی میں یہ وہ خلا تھے جنہیں پُر کرنا ازبس ضروری تھا۔ اگر انہیں پُر کرنے کے لیے کوئی متوازی اسلامی تحریک نہ اٹھائی جاتی تو آج اس برعظیم میں مسلمان شدید مایوسی کا شکار ہوتے۔ اس وقت جبکہ پروپگنڈا کا طوفان ہر طرف سے اٹھایا جا رہا ہے ممکن ہے عوام اس کی افادیت کو پوری طرح نہ سمجھ سکیں لیکن ہمیں یقین ہے کہ وقت کے گزرنے کے ساتھ لوگوں کے اندر اس امر کا شعور پیدا ہو گا کہ اس تحریک نے مسلمانوں کو کتنا زبردست سہارا دیا ہے۔

آپ خود سوچیے۔ کیا تقسیم کے بعد مسلم لیگ ہندوستانی مسلمانوں کی پناہ گاہ بن سکتی تھی؟ اور کیا وہ بن سکی؟ یہ اسی دوسری متوازی تحریک ہی کا اعجاز ہے کہ آج ہندوستان کے مسلمان اس حقیقت کو جان گئے کہ ان کی طاقت کا مدار تعداد پر نہیں بلکہ ان لاثانی اصولوں پر ہے جن کی وجہ سے انہیں امتِ وسطیٰ کہا گیا ہے۔ اس سرزمین میں اپنی اسلامی انفرادیت کو بچانے اور اسلام کی شمع روشن رکھنے میں پوری طرح مصروفِ عمل ہیں۔ یہ تحریک اگر اس آڑے وقت میں انہیں رجوع الی اللہ کے لیے آمادہ نہ کرتی تو وہ لوگ بالکل ہمت ہار چکے تھے۔ ذرا ہندوستان کے حالات کا مطالعہ کیجیے آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ جمیعت علمائے ہند اور مسلم لیگ دونوں وہاں کے مسلمانوں کے لیے بے کار ثابت ہوئی ہیں۔

پھر ذرا اس بات پر بھی غور کیجیے کہ اگر مسلم لیگ تقسیم ملک کے لیے اپنا پورا زور لگا دینے کے بعد بھی خدانخواستہ اس کوشش میں ناکام ہو جاتی تو ان حالات میں کیا وہ مسلمان قوم کے احساس شکست کا کوئی مداوا کر سکتی تھی؟ کیا دنیا میں کوئی مثال اس کی موجود ہے کہ ایک جماعت لڑ کر ہار جانے کے بعد پھر کھڑی رہ سکے؟

اس حالت میں کیا احتیاط کا تقاضا یہ نہ تھا کہ مسلمانوں کے لیے ایک دوسرا خط مدافعت (SECOND LINE OF ACTION) اور ایک محفوظ طاقت (RESERVE FORCE) ایسی مہیا رہے جو آگے کی صفوں کے شکست کھا جانے کی صورت میں قوم کو سنبھالنے کے قابل ہو؟ آج آپ فتح حاصل ہو جانے کے ۱۴ سال بعد باتیں بنا رہے ہیں۔ مگر ۱۹۴۰ء اور ۱۹۴۷ء کے درمیان جو حالات تھے انہیں سمجھنے کی کوشش کیجیے۔ ۱۹۴۷ء کے ابتدائی دور تک ملک کا تقسیم ہو جانا یقینی نہ تھا اور ناکامی کے امکانات خارج از بحث نہ ہو سکتے تھے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اُس وقت جس شخص نے پانچ چھ سو مخلص کارکنوں کا ایک مختصر سا گروہ اس غرض کے لیے منظم کیا کہ اگر خدانخواستہ اس جنگ میں مسلم لیگ ناکام ہوگئی تو یہ گروہ مسلمانوں کو سنبھالنے کی خدمت انجام دے سکے۔ اور اس گروہ کو جنگ سے الگ رکھا تاکہ اس کے لیے کام کرنا ممکن ہو، کیا اس نے یہ اپنی قوم کے ساتھ کوئی برائی کی تھی؟ یہ دُور اندیشی مذمت کی مستحق ہے یا اعتراف کی؟

پھر مسلم لیگ نے تقسیمِ ملک کا مرحلہ تو بلاشبہ طے کر لیا اور اس کی کامیابی اسی کی کوششوں کی رہینِ منت ہے، ہم اس حقیقت کو پوری طرح تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا لیگ پاکستان میں مسلم قوم کی اُن آرزوؤں اور تمناؤں کی تکمیل کے لیے بھی کچھ کر سکی جن کی خاطر ہی اس قوم نے خاک و خون کے سمندر میں سے گزرنا گوارا کیا تھا؟ راجہ محمود آباد کی قماش کے لوگ آج جو چاہیں کہتے رہیں، لیکن یہ حقیقت سورج سے زیادہ روشن اور دن کے اُجالے سے زیادہ واضح ہے کہ ہندی مسلمانوں نے ایک الگ خطۂ ارضی کا مطالبہ صرف اس لیے کیا تھا کہ وہ خواہ زندہ رہیں یا مریں لیکن یہاں ایک اسلام کی تجربہ گاہ ضرور قائم ہو جائے۔ آپ خود ہی غور کیجیے کہ اس نصب العین کی بے حرمتی میں جو ہاتھ شامل ہیں اُن میں کتنی تعداد اُن ہاتھوں کی ہے جنہوں نے کبھی مسلم لیگ کے پرچم کو سنبھال رکھا تھا اور جن کی قیادت میں کبھی "پاکستان کا مطلب کیا لا الٰہ الا اللہ" کے فلک شگاف نعرے لگا کرتے تھے۔ یہ درحقیقت کوئی اتفاقی حادثہ نہیں ہے بلکہ تقسیم سے برسوں پہلے اس کے آثار نظر آ رہے تھے اور کوئی دُور اندیش آدمی یہ دیکھ رہا تھا کہ ان ہاتھوں سے جو ریاست قائم ہوگی اس میں اسلام کے متعلق ان وعدوں کا کیا حشر ہوگا۔ اس نے آگے کے ان حالات کا محض پیشگی اندازہ ہی نہیں کیا بلکہ صاف صاف لکھ بھی دیا کہ ان کی بنائی ہوئی ریاست کے رنگ ڈھنگ کیا ہوں گے، اور آج ہر ایماندار آدمی دیکھ سکتا ہے کہ جو کچھ اس نے کہا تھا وہ لفظاً بلفظاً صحیح ثابت ہوا۔ اب اگر اُسی دُور اندیش انسان نے یہ وقت آنے سے برسوں پہلے ایک تربیت یافتہ منظم جماعت اس غرض کے لیے تیار کرنی شروع کر دی کہ اسلام سے جب یہ فرار ہونے لگے تو وہ جماعت غلط کار ہاتھوں کو روکنے کے قابل ہو تو کیا اس نے اپنی قوم اور اپنے دین کے ساتھ یہ کوئی بے وفائی کی تھی؟ اس کے اس کام پر اُن لوگوں کا غصہ تو سمجھ میں آ سکتا ہے جن کی غلط کاریوں کے راستہ میں یہ شخص اور جماعت مزاحم ہے؟ مگر کیا اس خدمت پر وہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مسلمان قوم کی ناراضی کے بھی مستحق ہیں؟

جو لوگ آج مولانا مودودی پر پاکستان دشمنی کے الزامات لگا رہے ہیں وہ خود آج سے چند سال پیشتر پاکستان کے کتنے حامی اور خیر خواہ تھے اور انہیں ملت کا کتنا درد تھا، اور اس کی خدمت کے لیے انہوں نے کتنی قربانیاں دیں، اُن کا حال پوری قوم جانتی ہے۔ اس لیے ہم اس سلسلے میں کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھتے۔ البتہ اس امر کی وضاحت کے لیے کہ بیس بیس پچیس پچیس سال پہلے کی تحریروں کو ان کے تاریخی پس منظر اور اس زمانے کے حالات سے قطع نظر کر کے کھنگالنا کس قدر غلط ہے، ہم اسی دور کی تاریخ کا ایک اور باب بھی سامنے لا کر رکھتے ہیں تاکہ ہر معقول آدمی سمجھ سکے کہ پرانی چیزوں سے اُلٹے سیدھے نتائج نکالنے پر اگر کوئی اُتر آئے تو کس کا دامن بچا رہ پائے گا۔ یہ باب ہماری ملت کی دو نہایت محترم شخصیتوں سے تعلق رکھتا ہے۔ دونوں بزرگ ہر طبقے میں انتہائی عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ ان کی خدمات اور بے لوثی کا سب کو اعتراف ہے۔ اُن کے بارے میں کچھ عرض کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ ہم خدانخواستہ اُن کی تذلیل کرنا چاہتے ہیں، بلکہ ہمیں صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ ایک دور کے حالات دو مخلص اصحابِ فکر کو کس طرح دو مختلف نتائج تک لے جاتے ہیں اور وہ شخص کیسی سخت غلطی کرے گا جو حالات کے پس منظر کو اور ان اصحاب کے نقطۂ نظر کو سمجھے بغیر اُن میں سے کسی ایک کو برسرِ غلط ٹھیرانے اور کسی کے اخلاص پر شبہ کرنے کی جسارت کرے۔

ان شخصیتوں میں سے پہلی شخصیت ڈاکٹر سر محمد اقبال کی ہے۔ مسلم لیگ اور قائداعظم سے انہیں جو قلبی لگاؤ تھا اس کے بارے میں کبھی دو رائیں نہیں ہو سکتیں۔ لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ ایک وقت ایسا بھی تھا جب ڈاکٹر صاحب نے لیگ اور قائداعظم دونوں کی مخالفت کی۔ مسلم لیگ کے سرگرم کارکن اور ڈاکٹر اقبال کے دیرینہ نیازمند ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی نے اپنی کتاب "اقبال کے آخری دو سال" میں اس کی جو تفصیل بیان کی ہے وہ ذیل میں درج کی جاتی ہے:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

"تحریک عدم تعاون کے زوال کے بعد جب آل انڈیا مسلم لیگ کی نشاۃ ثانیہ کا دور شروع ہوا۔ اور اس دور کا پہلا اجلاس مئی ۱۹۲۴ء میں لاہور کے گلوب تھیٹر میں منعقد ہوا تو ڈاکٹر صاحب کے مکان واقع میکلوڈ روڈ اور گلوب تھیٹر کی دیواریں ساتھ ساتھ تھیں۔ لیکن اس قربِ مکانی کے باوجود ڈاکٹر صاحب نے مسلم لیگ کے جلسے میں قدم رکھنا بھی گوارا نہ کیا۔ دسمبر ۱۹۲۷ء میں جب مسلم لیگ کے دو حصے ہو گئے تو ڈاکٹر صاحب جناح لیگ کے مخالف اور شفیع لیگ کے حامی تھے۔ یہاں تک کہ وہ شفیع لیگ کے سکرٹری بھی بن گئے تھے۔ ۱۹۲۹ء میں جب مسلم لیگ کا زور توڑنے کے لیے آل انڈیا مسلم کانفرنس معرضِ وجود میں آئی تو ڈاکٹر صاحب اس کانفرنس کے بڑے سرگرم رکن تھے۔ پہلے وہ اس کی مجلسِ عاملہ کے ممبر اور پھر اس کے صدر بن گئے تھے۔

ڈاکٹر سیف الدین کچلو جو راقم التحریر کے دیرینہ کرم فرما اور دوست ہیں ۲۸-۱۹۲۷ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے سکرٹری اور مسٹر جناح کے دستِ راست تھے۔ انہوں نے ایک مرتبہ ذکر کیا تھا کہ "جب دسمبر ۱۹۲۸ء میں کلکتہ کی آل انڈیا کنونشن نے ان تینوں ترمیموں کو بیدردی سے رد کر دیا جو مسٹر جناح نے پیش کی تھیں تو مسلم لیگ کی حالت سخت نازک ہو گئی۔ مسلمانوں کا سوادِ اعظم مسلم کانفرنس کی قیادت میں آ چکا تھا۔ اُدھر کانگرس نے یوں ہمارا دستِ تعاون جھٹک دیا۔ ان حالات میں ڈاکٹر اقبال کی خدمت میں لاہور حاضر ہوا تاکہ مفاہمت کی کوئی صورت پیدا کی جائے۔ ڈاکٹر صاحب نے مسٹر جناح کے رویے پر سخت نکتہ چینی کی اور فرمایا کہ مسلمانوں کی سیاست میں مسٹر جناح نے جو الجھن پیدا کر دی ہے جب تک وہ اس پر ندامت کا اظہار کر کے آئندہ اس سے کلیتۃً مجتنب رہنے کا وعدہ نہ کریں مصالحت نہیں ہو سکتی۔" (ص ۳۰۸-۳۰۹)

اب ذرا سوچیے کہ آج اگر کوئی شخص صرف اس اقتباس کو سامنے رکھ کر یہ کہنا شروع کر دے کہ ڈاکٹر اقبال مسلم ملت کے بدخواہ اور قائدِ اعظم کے مخالف تھے، یا قائدِ اعظم نے کسی وقت مسلم ملت کو

(باقی صفحہ ۲۰ پر)

© rasailojaraid.com